احمد ندیم قاسمی

قومی ثقافت اور اس کے علاقائی عوامل

یہ مغالطہ بہت عام ہے کہ علاقائی ثقافت کی قومی پالیسی میں، حدود کے تعین کے مسئلے پر، کبھی غور نہیں کیا گیا اور اس طرح مرکزیت کے تصور اور ماضی میں ہماری قومی ثقافتی پالیسی کے نتائج پر بھی غور نہیں کیا گیا ـــــ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ثقافت کے ان دونوں مسائل پر اہل ادب اور اہل فن سالہا سال سے غور کر رہے ہیں اور ان موضوعات پر اتنا مواد جمع ہو چکا ہے کہ اسے یکجا کر کے چھاپنے سے تین چار ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ خود میں نے اپنی تصنیف ''تہذیب و فن'' کے پچاس صفحات انہی ثقافتی مسائل کے لیے وقف کیے ہیں۔ پھر کلچر پر متعدد اربابِ شعر و ادب کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔

ایک روز جب میں نے ایک پڑھے لکھے بزرگ سے گفتگو کرتے ہوئے، محض ان کا [illegible] کریدنے کے لیے، کہا تھا کہ ہم میں سے تو کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا قومی کلچر کیا ہے، تو بزرگ موصوف خاصے خفا ہو گئے تھے اور میں ان کے خفا ہونے سے خوش ہوا تھا کہ ممکن ہے گرماگرمی کے اس عالم میں وہ ہمارے کلچر کے عنوانات کی نشاندہی فرما دیں۔ مگر افسوس کہ ایک اعلیٰ پائے کے دانشور ہونے کے باوجود وہ صرف خفا ہی ہوتے رہے۔ اس دوران انھوں نے پتے کی صرف ایک بات کی۔ انھوں نے فرمایا ''بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ قوم کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس کا قومی کلچر کیا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی قوم اس دنیا میں موجود ہے تو اسے اپنے

کلچر کے خد و خال فوراً معین کر لینے چاہئیں ورنہ اس کا قومی تشخص ہی خطرے میں پڑ جائے گا''۔ وہ یہ بتائے بغیر کہ ہمارا قومی کلچر کیا ہے، بضد رہے کہ ہمارا ایک قومی کلچر ہے۔ وہ میرے محترم تھے۔ میں ان کا ''تعاقب'' کرنے کی جسارت نہ کر سکا اور یہ جسارت شاید اس لیے بھی نہ کر سکا کہ اگر وہ پلٹ کر مجھ ہی سے پوچھ بیٹھے کہ ہمارا قومی کلچر کیا ہے؟ تو میں اتنا طویل جواب کیسے عرض کروں گا جو ذیل میں درج ہے:

خدانخواستہ میرا مقصد یہ نہیں کہ ہمارا قومی کلچر سرے سے ہے ہی نہیں۔ قوم کا ہر فرد، دن رات کے آٹھ پہروں میں جو کچھ کرتا ہے، وہ اس کے کلچر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ پوچھنا کہ ہمارا کلچر کیا ہے، سورج کی طرف دیکھ کر اس قسم کا سوال پوچھنے کے مترادف ہے کہ سورج کہاں ہے؟ بعض براعظموں میں آج بھی انسانوں کے ایسے گروہ بستے ہیں جن کے روز و شب کے مطالعے سے ہم پتھر اور دھات کے زمانوں کے انسان کے روز و شب کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، مگر یہ لوگ بھی کلچر سے محروم نہیں۔ کلچر کسی گروہ، کسی طبقے، کسی قوم کے مخصوص طرز زندگی کے سوا اور کیا ہے۔ تو پھر ان غیر ترقی یافتہ قبائل کا بھی ایک کلچر ہے۔ کلچر سے کوئی گروہ، کوئی قوم محروم نہیں ہے۔ معلومہ تاریخ سے پہلے بھی جسے لوگ زمانۂ قبلِ تاریخ کے علاوہ زمانۂ قبلِ تہذیب بھی کہہ دیتے ہیں، انسانی گروہوں کے اپنے اپنے کلچر ہوتے تھے۔ آخر اس دور میں بھی تو زندہ رہنے کا ایک خاص ڈھب ہوتا تھا اور کلچر طریقِ حیات ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب انسان نے کائنات پر غور کرنے کی منزلوں سے آگے نکل کر کائنات میں سفر کرنے کا آغاز کر دیا ہے اور ایک خود شناس اور باشعور اور بہادر قوم کسی قومی کلچر سے محروم ہو، سو پاکستانی قوم کا بھی ایک قومی کلچر یقیناً ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس قومی کلچر کی اپنی تعریف کرتا ہے اور ایک تعریف دوسری تعریف سے اکثر و بیشتر سراسر مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے دینی اور تعلیمی علماء، بڑے بڑے شعراء و ادباء، بڑے بڑے مصلحین و سیاسین گذشتہ کئی برس میں متعدد بار قومی کلچر پر اظہار رائے فرما چکے ہیں۔ اس کے باوجود اگر

اس کلچر کی ہیئت ابہام کی شکار ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنے قومی کلچر سے متعلق باواضح نہیں ہے یا ذاتی تعصّبات کا شکار ہے۔ اس سبب سے ہمارے ہاں کلچر بے نظمی (میں اسے بدنظمی نہیں کہوں گا) پھیلی ہوئے ہے۔ کلچر کے بعض مظاہر اگر ایک گروہ کے نزدیک کشتنی ہیں تو دوسرے گروہ کے خیال میں کلچر کی زندگی اور توانائی کا ثبوت ہیں۔ اس طرح پہلے گروہ کی رائے میں ہمارے قومی کلچر کی جو خصوصیات ہیں وہ دوسرے گروہ کی نظر میں اس ترقی یافتہ اور سائنسی دور اور خلا نوردی کے زمانے میں ناقابل قبول اور اس لیے سوختنی ہیں۔ دو گروہوں کا ذکر میں نے محض اپنی بات سمجھانے کے لیے کیا ہے ورنہ کلچر کے بارے میں تو یہاں فرد بہ فرد اختلاف ہے۔ بظاہر ایسی بات پڑھنا اور سننا بھی بہت تکلیف دہ ہے مگر اس حقیقت کے ثبوت مہیا ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ادارہ پاکستان کے قومی کلچر کے موضوع پر ایک عالم دین، ایک سائنسدان، ایک مزدور، ایک کسان، یونیورسٹی کے ایک استاد، ایک شاعر، ایک سیاستدان، ڈیفنس کے ایک ریٹائرڈ اعلیٰ افسر، گلبرگ کی ایک بیگم، لاہور کے ایک محلے مصری شاہ کی ایک خاتون، گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم اور کسی یتیم خانے کے ایک منصرم کو مضمون لکھنے یا تقریر کرنے کی دعوت دے تو موجودہ حالات میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان میں سے کسی کے خیالات کسی دوسرے کے خیالات پر منطبق ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد تک تو اتفاقِ رائے ممکن ہے مگر باقی پچانوے فیصد پر اختلاف ہی کی کارفرمائی ہوگی۔ اس صورت حال کو کلچرل بے نظمی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

قومی کلچر نہ تو کوئی ایسی جنس ہے جسے بازار میں خریدا جا سکے اور نہ ہی کوئی ایسا علم ہے جسے کسی دانشگاہ سے حاصل کر کے عام کیا جا سکے۔ قومی کلچر تو اس قوم کے رگ و پے میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ وہ اس کلچر کی روشنی میں اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا، سوچتا، فکر کرتا، محبت اور نفرت کرتا، ارادے باندھتا اور امنگیں پیدا کرتا، تجربوں میں سے گزرتا اور آدرشوں کو اختیار کرتا، گاتا اور تصویریں بناتا، شعر کہتا اور مابعد الطبیعات کو ادراک کی گرفت میں لاتا، کائنات

کو تسخیر کرتا، اور زندگی کو رہنے کے لائق بناتا ہے۔ قومی کلچر میں جو یہ وسعت اور گہرائی ہے، یہ صدیوں کے انسانی رشتوں اور سوچوں اور امنگوں کی تخلیق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قومی کلچر کی طرف ہماری صحیح رہنمائی قومی تاریخ کرتی ہے اور قومی تاریخ کسی خاص صدی کے کسی خاص سال کے کسی خاص دن سے شروع نہیں ہوا کرتی۔ تاریخ کا آغاز تو ہمیشہ ماضی کی دھند اور مزید دھند اور پھر مزید دھند میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ یوں کسی بھی قوم کی تاریخ صرف چند برس یا صرف چند صدیوں پر پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ قومی کلچر قومی تاریخ سے بڑی شدت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ قومی تاریخ اس جغرافیائی خطے کی تاریخ ہوتی ہے جس میں یہ قوم بستی ہے۔ سو قومی کلچر بھی اس مٹی کی پیداوار ہوتا ہے جسے خاک پاک وطن کہتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارا کلچر اس خطۂ ارض کی معلومہ تاریخ جتنا پرانا ہے۔ البتہ ساتھ ہی اس نقطے سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیئے کہ کلچر کسی ہمیشہ کے لیے مقرر اور منضبط لائحہ عمل کا نام نہیں ہے۔ کلچر انسانی ذہن کی طرح نامیاتی ہے۔ یہ مسلسل بدلتا اور سنورتا اور ارتقاء پذیر رہتا ہے اور جب کوئی کلچر بظاہر مر جاتا ہے تو وہ دراصل مرتا نہیں ہے بلکہ اس کی بعض زندہ رہنے والی خصوصیات دوسرے کلچر میں نفوذ کر جاتی ہیں یا پھر اس کی بعض قدروں کی صورت بدل جاتی ہے اور یہ سب تبدیلی انسانی ذہن کے ترقی کے تابع ہے — انسان جو صناع بھی ہے، تخلیق بھی کرتا ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بھی اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

جب کوئی مورخ پاکستان کی تاریخ کا آغاز موئن جو دڑو یا ہڑپہ سے کرتا ہے تو بعض عناصر کو یہ جسارت بہت ناگوار گذرتی ہے۔ محض اس لیے کہ موئن جو دڑو یا ہڑپہ کی تہذیب تو بت پرستوں اور مشرکوں کی تہذیب تھی اس لیے ہمارا ان سے کیا رشتہ۔ اپنی تاریخ اور اپنے کلچر کے سلسلے میں یہ نہایت درجہ جذباتی طرز عمل ہے۔ جب موئن جو دڑو اور ہڑپہ کی تہذیب سے ہم اپنی تاریخ اور کلچر کا آغاز کرتے ہیں تو اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہوتا کہ ہمیں بت پرستی عزیز ہے یا ہم اپنے ماضی، قریب کی تاریخ اور اپنے موجودہ کلچر سے بدظن ہیں۔ اس کا مفہوم تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں کہاں کا سفر کرتے ہوئے کہاں پہنچے

ہیں۔ وہ قدیم تہذیبیں اپنی بعض خصوصیات کو مستقبل کے حوالے کر کے ختم ہوگئیں۔ موئن جو دڑو سے اپنی تاریخ کا آغاز کرنے کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ ہمیں موئن جو دڑو کے سے شہر بسانے کا شوق ہے اور ایسے ہی ظروف استعمال کرنے کی آرزو ہے اور ایسے ہی بت تراشنے کی امنگ ہے۔ ویدک اور برہمنی اور بودھی کلچر (اور شاید بیچ میں یونانی کلچر بھی) آئے اور بعض آثار کو مستقبل کے حوالے کر کے چلے گئے۔ پھر اس خطۂ زمین میں عرب وارد ہوئے۔ اس کے بعد افغان آئے۔ پھر مغل آئے پھر انگریز آئے اور اب انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ یہاں پاکستانی ہی حکمران رہیں گے۔ مگر ہم اتنے بہت سے کلچروں کو آخر کس منطقی دلیل سے نظر انداز کر سکتے ہیں اور اگر انھیں نظر انداز ہی کرنا ضروری ٹھہرتا ہے تو پھر آخر کیا سبب ہے کہ ہم جس انداز میں یہاں پاکستان کے اندر رہتے ہیں اور ہمارا جو قومی طرز حیات ہے وہ اہل مصر یا اہل لیبیا، یا اہل مراکش یا اہل شام یا اہل ترکی یا اہل ایران یا اہل افغانستان یا اہل ملیشیا یا اہل انڈونیشیا کا سا طرز حیات نہیں ہے۔ یہ اہل ہندستان کا سا طرز حیات بھی نہیں ہے۔ یہ خالصتاً پاکستانیوں کا اپنا طرز حیات ہے اور یہ طرز حیات ہمیں ہمارے دین اور ہمارے عقائد کے علاوہ ہماری تاریخ اور ہمارے جغرافیائی حالات نے بھی دیا ہے۔ یقیناً ہم مسلمان ہیں اور یقیناً ہمیں مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ یقیناً ہمارے قومی کلچر کی صورت پذیری میں غالب کردار ہمارے مذہب کا ہے۔ یقیناً جب ہم لا الہ کہتے ہیں تو ذہنوں کے سب بت پاش پاش ہو جاتے ہیں اور (ماسوا اللہ) دنیا کی ہر قوت ہمارے سجدے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی ہے۔ یقیناً ہمارے قومی کلچر کی تشکیل میں خدائے واحد کی پرستش اور خدا کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکانے کے جذبۂ محترم کو بڑا دخل حاصل ہے لیکن ہمیں اتنا حقیقت پسند تو ہونا ہی پڑے گا کہ ہمارا لباس عربی لباس سے مختلف ہے کیونکہ ہمارے ہاں اس شدت کی گرمی نہیں پڑتی اور ہمیں ام کلثوم سے زیادہ روشن آرا بیگم اور نور جہاں اور عابدہ پروین کا انداز موسیقی بھلا لگتا ہے کیونکہ وہ پاکستانی لے اور پاکستانی دُھن اور پاکستانی سُر میں پاکستانی جذبات کو پاکستانی زبان میں ادا کرتی ہیں۔ آخر کلچر کے ان مظاہر کے اختلاف کا اعتراف کرنے میں

ہمارا کون سا عقیدہ مزاحم ہے اور اگر کوئی عقیدہ مزاحم نہیں تو ہم اپنی تاریخ سے ڈرتے کیوں ہیں۔؟

قومی تاریخ اور اس طرح قومی کلچر کی تاریخ کا مطالعہ طے ہو جائے تو قومی کلچر کی وضاحت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور اسے جلد سے جلد طے ہونا چاہیئے ورنہ قومی کلچر کے باطنی یا روحانی مظاہر یعنی شعر و ادب اور مصوری و موسیقی نیز دیگر فنون لطیفہ کا مستقبل مخدوش رہے گا۔ اس خدشے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں فنون کو گناہ اور فن کار کو گنہگار سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ لوگ جنہیں فن کاری کا دعویٰ ہوتا ہے، سب کے سب فنکار نہیں ہوتے اور وہ چیزیں جو فن کے نام پر تخلیق کی جاتی ہیں، سب کی سب فن نہیں ہوتیں مگر فنون میں حسن و قبح کا مرحلہ بھی تو اس وقت آتا ہے جب فنون کے سلسلے میں ہمارا طرزِ عمل بلکل واضح ہو۔ اسی گومگو کا نتیجہ ہے کہ ہمارے فنی معیار ابتری کے شکار ہیں۔ جن فنی تخلیقات کے معیار گر جاتے ہیں تو یہ اس خطرے کی نشانی ہوتی ہے کہ ہم اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے سلسلے میں واضح نہیں ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہماری قوم کیا سوچ رہی ہے اور اس کی روحانی ضرورتیں کیا ہیں۔ یوں خوبصورتی اور بھدا پن آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور قوم کی حسِ امتیاز کند ہو جاتی ہے۔ خدا نہ کرے ہم پر ایسا سانحہ گزرے لیکن اپنے کلچر کے سلسلے میں ہمارا ضغطہ — ہمارا گومگو کا عالم بے حد تشویشناک ہے۔ اس معاملے میں حقیقت پسندی اور جرأت مندی سے کام لینا چاہیئے۔ حقیقت پسندی سے یوں کہ ہم اپنی تاریخ کا تعین کر لیں اور جرأت مندی سے یوں کہ اس کا اظہار کر دیں اور اپنے بڑوں سے بڑے ادب کے ساتھ گزارش کریں کہ کلچر کی اہمیت کو پہچانیے۔ جس قوم کو اپنے کلچر کا شعور نہ ہو وہ روحانی طور پر منتشر رہے گی۔ قوم کی انفرادیت اس کے انفرادی کلچر میں پوشیدہ ہوتی ہے اور قومی انفرادیت کے مکمل اور غیر مبہم شعور کے بغیر قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا خواب تعبیر کو ترستا رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ہمارا قومی کلچر موجود ہے مگر اس کے خد و خال دھندلائے ہوئے ہیں۔ اس کلچر کو اپنے بڑوں کی منظوری درکار ہے۔ یہ منظوری فوراً ملنی چاہیئے کیونکہ قومی

تعمیر وارتقاء کے سفر میں ہم زیادہ دیر تک ایک جگہ پڑاؤ ڈالے نہیں رہ سکتے۔ البتہ اس پہلو سے ہمیں قطعی واضح ہونا چاہیئے کہ ہمارا جو بھی کلچر ہے وہ پاکستانی کلچر ہے — عرب اور ایرانی اور ہندی کلچروں سے مختلف ہمارا اپنا انفرادی پاکستانی کلچر —

پاکستانی ثقافت کا عنوان یقیناً تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے۔ یہ حقیقت مفکرین اور دانشوروں کے ہر مکتبِ فکر کو قبول کر لینی چاہیئے اور مزید کچھ مدت تک کسی خود فریبی میں مبتلا رہ کر پاکستان کے انفرادی کلچر کے مسئلے کو ابہام کے سپرد نہیں کیے رہنا چاہیئے۔ البتہ جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، اس حقیقت سے وابستہ ایک اور حقیقت سے آنکھیں چرانا کوئی دانائی اور دور اندیشی نہیں ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ثقافت میں اس مٹی کی بو باس ضرور موجود ہوتی ہے جہاں وہ ثقافت پیدا ہوئی، پھیلی پنپی اور بدلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی اسلامی ممالک اس وقت کرہء ارض پر موجود ہیں، ان کی ثقافتیں اگر بعض بنیادی امور میں مماثل ہیں تو بعض تفاصیل میں مختلف بھی ہیں۔ اسلامی ممالک کی ثقافتی مماثلتیں اگر تہذیب کے اسلامی تصور کی پیداوار ہیں تو ان ثقافتوں کے اختلافات ان ملکوں کی ہزاروں برس کی تاریخ، وہاں کے خاص معاشرے، خاص معیشی رشتوں، خاص آب و ہوا اور خاص مٹی کی تخلیق ہیں۔ اگر ہماری شیروانی کو سکھوں نے بھی اپنے قومی لباس میں شامل کر رکھا ہے اور اگر ہم اپنی شیروانی دوسرے اسلامی ملکوں کو نہیں پہنا سکتے تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات ہے، نہ شرمندہ ہونے کی اور نہ طیش میں آنے کی۔ اگر ہندستانی کلچر کے بعض پہلو ہمارے کلچر کی بعض شقوں سے مماثل ہیں تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم سب عربوں اور پٹھانوں اور مغلوں اور انگریزوں کے کلچروں سے یکساں طور پر متاثر ہوتے رہے ہیں مگر اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ ہندستان اور پاکستان کا کلچر ایک ہے۔

کلچر پیدا نہیں ہوتے جس طرح تہذیبیں پیدا نہیں کی جاتیں۔ یہ تو عقائد اور تاریخی واقعات اور جغرافیائی حالات اور مختلف کلچروں کے تصادم سے پیدا ہونے والے اثرات کا کھیل ہے۔ سو پاکستان کے لیے شعوری طور پر ایک قومی کلچر پیدا کرنے کی خاطر نہ کوئی

کانفرنس بلانے کی ضرورت ہے اور نہ دانشوروں کی کسی کمیٹی کی تشکیل کی ۔ایوب خاں کے دور میں محترم فیض احمد فیض کی رہنمائی میں مغربی اور مشرقی پاکستان میں پاکستانی کلچر کی جستجو ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی شخصیتوں سے انٹرویو کیے گئے۔ اس کمیٹی پر کھاتا پیتا بورژوا طبقہ مسلط تھا۔ میرا اس طبقے سے کوئی رشتہ رابطہ نہیں ہے اس لیے مجھے بجا طور پر ایک معمولی شخص سمجھ کر نظر انداز کیا گیا لیکن اگر اس کمیٹی کے افراد میرے پاس تشریف لانے کا حوصلہ فرماتے تو میں ان کی خدمت میں وہی کچھ عرض کرتا جو اس وقت آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ چنانچہ کلچر موجود ہے مگر اس کے وجود کا احساس پیدا کرنے کے لیے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ پھر جب ہماری بصیرت ہم پر واضع کر دے کہ بہ حالات موجود ہمارے قومی کلچر کے خد وخال یہ ہیں تو البتہ یہ ممکن ہے کہ ہم اس قومی کلچر کو ہمہ گیر اور ہمہ اثر بنانے کے لیے اپنے ہاں کے مختلف کلچروں سے استفادہ کریں اور اپنے کلچر کی ان خصوصیات کو نمایاں کریں جو پنجابی، سندھی، بلوچ، اور کشمیری، ہونے کے باوجود ہم سب کو عزیز اور محبوب ہوں۔

پاکستان کے کلچر میں یہاں کی تاریخ، یہاں کے جغرافیائی حالات، یہاں کی آبادی کی اکثریت کے بنیادی معتقدات کے علاوہ جو خصوصیت نہایت نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور اسے ہر حالت نمایاں ہی ہونا چاہیئے، وہ اس خطہء ارض کے مختلف لسانی حلقوں کے اپنے اپنے انفرادی کلچر ہیں۔ یاد رہے کہ ان علاقوں کی غالب آبادی مسلمان ہے، کسی ملک کا کلچر ہی اس کا تشخص معین کرتا ہے اور جو ملک ایک سے زیادہ زبانوں کے وسیع علاقوں پر مشتمل ہو، اس کا کلچر انہی علاقوں میں بولی جانی والی زبانوں اور ان سے متعلقہ ثقافتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو جس طرح پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور کشمیری کو علاقائی زبانوں کی بجائے پاکستانی زبانیں کہتا ہوں، اسی طرح ان زبانوں سے متعلقہ ثقافتوں کو بھی پاکستانی ثقافت کے مختلف اور متنوع مظاہر قرار دیتا ہوں۔ ان کی مثال مختلف رنگ اور خوشبو رکھنے والے ان پھولوں کی سی ہے جن کی یکجائی کا نام چمن ہے۔ اگر پاکستان ایک چمن ہے تو یہ

ثقافتیں اس چمن کے پھول ہیں۔ پھولوں میں رنگ اور خوشبو اور کلیوں اور پتوں کی صورتوں کے اختلاف کے باوجود ایک وحدت بھی کارفرما ہوتی ہے اور یہ حسن و جمال اور نگہت و رنگ کی وحدت ہے۔ چنانچہ پاکستانی ثقافت میں اگر دلبری ہے تو یہ پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچ اور کشمیری آبادی کی ان ثقافتوں کی دلبری ہے جن کا حسن ان کے تنوع میں ہے۔

ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے میں آخر میں بطور مثال اس کلچر کے صرف ایک رخ کا ذکر کروں گا۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اردو کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور کشمیری بھی ہماری پاکستانی زبانیں ہیں۔ ان کی اور ان میں تخلیق ہونے والے شعر و ادب کی ترویج و ترقی دراصل ہماری تہذیب و ثقافت کی ترویج و ترقی ہے۔ جو مشترکہ پاکستانی کلچر صورت پذیر ہو رہا ہے وہ انہی پاکستانی زبانوں اور ان سے منصوب نہایت دل آویز کلچروں ہی کی دین ہے، چنانچہ ہم لوگ ایک دوسرے کی زبانوں کے جتنے ؛قریب آئیں گے، اتنے ہی ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ ان زبانوں میں علم وادب کے جو بے بہا خزانے ہیں، دراصل وہی ہماری پہچانیں اور ہمارا تشخص ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری ان پاکستانی زبانوں میں شاعری نے بطور خاص ترقی کی ہے (اگرچہ سندھی میں افسانے بھی عالمی معیار کے لکھے جا رہے ہیں) زیادہ یقین سے تو میں پنجابی ہی کے بارے میں کچھ عرض کر سکتا ہوں مگر اس زبان کی دوسری بہنوں کے بارے میں بھی میں نے یہی سنا اور پڑھا ہے کہ ان میں بھی شعری ادب کو بطور خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ویسے بھی ہماری ان پاکستانی زبانوں میں کلاسیکی ادب کا بیشتر سرمایہ شاعری پر ہی مشتمل ہے چنانچہ قیام پاکستان کے بعد یہ عظیم شعری روایت بہت وسعت اور ہمہ گیری سے پروان چڑھی ہے اور ان زبانوں میں شاعری نے روح عصر کی اتنی صداقت اور حقیقت پسندی سے نمائندگی کی ہے کہ ہم اپنے ثقافتی سرمائے کو کہیں زیادہ گراں بہا، اور اپنی قوت اظہار کو کہیں زیادہ بلیغ پاتے ہیں۔

دراصل شاعری جذبہ و خیال کی زبان ہوتی ہے اور جذبہ و خیال کی ہزار رہا پرتیں

ہوتیں ہیں۔ چنانچہ زبانیں شعری لہجے ہی سے وسعت اور دلکشی حاصل کرتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان زبانوں کی شعری تخلیقات کے لہجے میں اتنی قوت اور توانائی نظر آتی ہے اور نفی سے اثبات کی طرف ہمارے سفر کو پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور کشمیری کی شاعری نے اتنا آسان اور ہموار بنایا ہے کہ اگر ہم اپنی زبانوں کے شعری شاہکاروں کے تراجم دنیا بھر کی ترقی یافتہ زبانوں کے سامنے رکھیں تو پڑھنے والے دم بخود رہ جائیں کہ اس سرزمین میں تخلیقی جمالیاتی حس کتنی ہمہ گیر ہے اور ان زبانوں میں نازک جذبوں کی گہری سے گہری پرتوں کا اظہار کتنے اعتماد سے کیا جارہا ہے۔

مگر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اپنی زبانوں کے شعری ادب کو منتقل کرنے کی بات تو الگ رہی، ہم تو قیام پاکستان سے اب تک اس قابل بھی نہیں ہو سکے کہ اس ادب کے بین اللسانی تراجم ہی مہیا کرسکیں، اور کچھ نہیں تو ان پاکستانی زبانوں کی شاعری کو پاکستان کی قومی زبان کا ملبوس پہنا سکیں۔ یہ کام ایک حد تک تو یقیناً ہوا ہے، مگر محض ایک حد تک۔ نتیجہ یہ کہ ہم ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ ہم بظاہر باہمی مصافحے اور معانقے تو کرتے رہتے ہیں مگر اصل معانقہ تو دماغوں اور دلوں کا ہوتا ہے اور ہمارے دل و دماغ کی اصل نمائندگی ہمارے شعر و ادب میں ہوتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر ہم لوگ اپنی سب زبانوں سے، تراجم کی توسط سے، متعارف ہو جائیں تو کچھ ہی عرصے کے مطالعے کے بعد ہم محسوس کرنے لگیں گے کہ ہمارے ذہن ایک ساتھ متاثر ہوتے ہیں اور ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ہم بھی کتنے عجیب لوگ ہیں کہ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور کشمیر کے ساتھ اب تک صحیح طور پر اور کھرے انداز میں متعارف ہی نہیں ہو سکے۔ ان زبانوں کا وہ شعری ادب ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ سب سے سچا تعارف ہے جو قیام پاکستان سے پہلے اور بعد وجود میں آیا ہے اور جس میں ہم سب کی امنگیں اور آرزوئیں، دکھ اور سکھ، احتجاج اور اعتراف بڑے خلوص اور خوبصورتی کے ساتھ منعکس ہوئے ہیں۔

صرف پاکستان ہی میں نہیں، یہ حقیقت ہر جگہ مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ ہر ملک کی

ملک زبانوں کا ادب ہی باہمی خیر سگالی اور افہام و تفہیم کا نہایت موثر اور یقینی ذریعہ ہوتا ہے اور اس خیر سگالی کی فضا میں ایک مشترک قومی کلچر صورت پذیر ہوتا ہے جو ذیلی کلچروں کی اس لیے ایسی نہیں ہوتا کہ قومی کلچر تو اپنے اندر نمو اور توانائی کا رس ہی ان کلچروں سے حاصل کرتا ہے۔ اس قومی کلچر کی تو جڑیں ہی ان متنوع کلچروں میں ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ ملک پاکستانی زبانوں کے شعر و ادب کو ایک کلچر کی صورت پذیری کے سلسلے میں قریب قریب الگ انداز ہی کیا جاتا رہا ہے۔ ہم خیر سگالی اور بھائی چارے اور ایک ہمہ گیر قومی کلچر کے نعرے تو بہت لگاتے ہیں، لیکن اگر صرف نعرے لگانے سے مسائل حل ہو سکتے تو پاکستان کے مسائل کب کے حل ہو چکے ہوتے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے مگر حق بات کا اعلان کرنا میرا فرض ہے کہ ہر پاکستانی زبان کے اہل قلم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی ملک کے اہل قلم ایک دوسرے کے نظریہء حیات اور نظریہء فن اور وہاں کے ثقافتی مظاہر سے اس حد تک بے خبر ہوں گے تو ملک کا وہ حصہ ان کی تخلیقات سے قطعی طور پر خارج ہوگا جو دوسری زبان بولتا ہے۔ شاید ہی کسی ملک میں اس قسم کی ایک صورت حال موجود ہو کہ وہاں کے ادیب بس اپنے اپنے علاقوں کے ادیب ہوں اور ان کی ملکی حیثیت محض نمائشی ہو۔ دوسرے ممالک کے ادیبوں کے افکار تو دوسرے براعظموں تک کو متاثر کر رہے ہیں مگر ہم ہیں کہ لاہور کی آواز کو حیدرآباد اور پشاور اور کوئٹہ تک نہیں پہنچا سکتے اور وہاں کی آواز لاہور نہیں پہنچ پاتی۔ پنجاب کا لاچا اور سندھ کی اجرک اور سرحد کی چپل اور بلوچستان کی ٹوپی اور کشمیر کے سماوار کے استعمال سے قومی ثقافت کا صورت پذیر ہونا اس وقت تک دشوار ہے جب تک ہمارے دل و دماغ کی پہنائیاں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ آخر یہ کیا ستم ہے کہ لاہور کا ادیب فرانس کے سارتر اور روس کے سولزے نتسن پر حاوی ہے مگر اسے پنجابی اور سندھی اور پشتو اور بلوچی اور کشمیری ادیبوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں اور دلچسپی اس لیے نہیں کہ وہ انہیں پڑھ ہی نہیں سکتا۔ یوں ہمارے ہاں افکار کا تبادلہ ہوتا ہی نہیں اور جب ایک ہی ملک کے حصے ایک دوسرے کے افکار سے اس حد تک بے خبر ہوں تو

ہم آہنگی اور یکجہتی اور قومی ثقافت کے نعرے بلکل کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ افکار و خیالات کے اس تبادلے اور میل جول سے ایسی پُر امن فضا قائم ہوسکتی ہے جو دوسرے عناصر اور اداروں سے قائم نہیں ہوگی کیونکہ ان کی مخصوص مصلحتوں کے لیے امن و سکون اور بھائی چارے کا ماحول اور قومی ثقافت کے پھولنے پھلنے کی فضا شاید راس ہی نہیں اس طرح کے منفی عناصر کی سرگرمیوں کی کاٹ بھی ادب اور صرف ادب کے پاس ہے۔ پاکستان کی کسی بھی زبان کے ادیبوں اور شاعروں میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو محدود علاقائی سطح پر سوچتے ہیں۔ سچے اہل قلم اور کھرے اہل فن عموماً فراخ دل اور سراپا محبت ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر مقامی مفادات کی بجائے ملکی اور مِلّی اور انسانی مفادات ہوتے ہیں چنانچہ پاکستان کی سرزمین پر پھیلے ہوئے مختلف اور رنگا رنگ کلچروں کی آویزش کی بجائے آمیزش ہی پاکستانی ثقافت کا تشخص متعین کرے گی کہ کسی ملک کی ثقافت ہی اس کا چہرہ ہوتی ہے اور انسانوں کی طرح قومیں بھی ایک دوسرے کو چہروں ہی سے پہنچانتی ہیں۔

☆☆☆